R. No. 2196/57.

Regd. No.

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

Telephone No. 32

Telegrams "ANJUMAN"

ہماری زبان

جلد ۲۰ - شمارہ ۴۷ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء

نادم سیتاپوری

ید بیضا

اس صدی کی پہلی دہائی میں اُردو کے جو کامیاب ماہنامے نکلے تھے ان میں الندوہ، اردوئے معلی، عصر جدید، زمانہ، الناظر، اور شمس (کلکتہ) وغیرہ تو اتنے مقبول و مشہور ہیں کہ شاید ہی کوئی ناواقف ہو؟ لیکن ان کے علاوہ کچھ رسائل اور بھی تھے جن کی معیاری افادیت ایک خاص ماحول میں محصور و محدود ہو کر رہ گئی۔ سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کا ماہنامہ "ید بیضا" بھی انھیں ماہناموں میں ایک تھا جو اپنے دور کے بلند و معیاری رسالوں میں اپنا خاص مقام رکھتا تھا مگر آج اس کا نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہیں کتب خانوں میں اس کے کچھ فائل موجود ہوں، عام طور سے دستیاب نہیں ہوتے۔

سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کو جسے چھپن سال بعد "ید بیضا" کے مولد بننے کا شرف حاصل ہوا، نصف صدی اُدھر پنجاب کے پہلے اُردو اخبار "کوہ نور" (لاہور، سن اجرا ۱۸۵۰ء) کے محسن بانی منشی ہرسکھ رائے کے وطن مالوف کی حیثیت سے ایک امتیاز حاصل ہو چکا تھا۔ اور منشی صاحب محض پنجاب کے پہلے اردو اخبار (کوہ نور) کے بانی ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کے اس "مدرسۂ صحافت" کے روح و رواں بھی تھے جس کے تربیت یافتہ درجنوں صحافی انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد دوں ہندوستانی صحافت کی مسند ادارت پر جلوہ فگن رہے۔ منشی نول کشور، نثار علی شہرت، محمد الدین فوق، سیف الحق ادیب، مرزا موحد، منشی محرم علی چشتی، نادر علی شاد، یہ سب ہی منشی ہرسکھ رائے کے "کوہ نور اسکول" کے تربیت یافتہ تھے! جن کی دھوم ایک مدت تک سارے ہندوستان میں مچی رہی۔ منشی ہرسکھ رائے اسی سکندر آباد کے قریب ہی کسی گاؤں کے رہنے والے تھے، سکندر آباد کے مکاتب میں تعلیم پائی تھی اور اوائل عمر میں لاہور چلے گئے تھے۔ سکندر آباد بلحاظ آبادی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر ادبی ماحول کے لحاظ سے اپنے ضلع میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا "ید بیضا" سے پہلے شاید ایک آدھ اخبار اور بھی یہاں سے نکلے ہوں، لیکن مشاعروں کی چہل پہل نے یہاں ہمیشہ ایک ادبی فضا اور ماحول بنائے رکھا۔ جو آخر کار ۱۹۰۶ء میں ایک ادبی ماہنامے کی شکل میں تخلیق ہو گیا۔

ہوا یوں کہ ۱۹۰۶ء میں جب قاضی سید محمد محسن وفا سیتاپوری (وفات ۱۹۳۶ء) سکندر آباد کے سب رجسٹرار ہو کر پہنچے تو وہاں کی ادبی اور مجلسی سرگرمیوں پر ایک نئی بہار سی آ گئی۔ وفا بے انتہا خلیق، ملنسار، ہنس مکھ اور باغ و بہار قسم کے آدمی تھے (رشتے میں میرے چچا تھے اور میرے نانا ناظر سیتاپوری کے شاگرد۔ فن شعر کو فنی اعتبار سے انھوں نے شاید ہی سیکھا ہو۔ ان کی فطری صلاحیتیں ان کے ذوق شعری کی زیادہ معین کار رہیں)۔ سکندر آباد کے مقامی استادوں میں ان دنوں قاضی غیاث الدین احمد خورشید سکندر آبادی کا طوطی بول رہا تھا سکندر آباد اور اطراف سکندر آباد میں ان کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ حکیم محمد سعید خنجر سکندر آبادی اور عبد الغفار خاں اختر الہ آبادی بھی خورشید ہی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ ماہانہ مشاعرے ہوتے ہی رہتے تھے۔ وفا، خنجر اور اختر نے باہم مشورہ کرکے ماہنامہ "ید بیضا" کے اجرا کی اسکیم بنائی۔ مالی مشکلات کا حل یہ نکالا گیا کہ عبد الغفار خاں اختر (جو میونسپل بورڈ سکندر آباد کے سکریٹری تھے) نے بورڈ سے ایک رقم مقرر کرا دی جس کے معاوضے میں بورڈ کی ماہانہ کارروائی اس رسالہ میں چھپتی تھی۔ اس کے علاوہ مالی امداد کا بڑا ذریعہ وہ معاونین تھے جن کے نام کبھی کبھی "ید بیضا" میں چھپا کرتے تھے اور ان میں سکندر آباد کے ایک رئیس کنور گردھر کرشن کا نام سر فہرست نظر آتا ہے۔ دوسرے نمبر پر وفا سیتاپوری ہیں۔ "ید بیضا" کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۰۶ء میں نکلا۔ اور میرے پاس اس کے نو شمارے موجود ہیں

ان میں آخری نمبر اگست ۱۹۰۹ء کا ہے۔ سالانہ چندہ معمولی کاغذ پر ایک روپیہ چار آنے اور عمدہ کاغذ پر ایک روپیہ بارہ آنے (والیان ملک سے (جو کچھ وہ عنایت فرمائیں) اور امراء و معززین سے چھ روپے سالانہ۔ ضخامت عام طور سے چالیس صفحات تھی بلند شہر کے "مطبع منشی ہرپرشاد" میں چھپتا تھا۔ بحیثیت ایڈیٹر حکیم محمد سعید خنجر سکندرآبادی کا نام شایع ہوا کرتا تھا۔ مجلس ادارت کے خاص رکن وفا سیتاپوری اور عبدالغفار اختر تھے، لیکن بحیثیت مدیر ان کے نام شایع نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ دونوں سرکاری عہدے دار تھے۔

اس شمارے میں سکندرآباد کے دو مشاعروں کا انتخاب ہے اور مضامین کی فہرست بہت ہی مختصر!

(۱) ہم اور ہماری ضرورت　　ایڈیٹر
(۲) رنج و راحت　　عبدالغفار اختر الہ آبادی
(۳) جولیس قیصر (۱)　　(انگریزی ناول کا ترجمہ)
(۴) نیرنگ زمانہ　　محمد تمکین الدین　　(یہ بھی انگریزی ناول کا ترجمہ ہے)

جن مشاعروں کا انتخاب شایع کیا گیا ہے ان میں زیادہ تر مقامی شعراء ہیں۔ غیر سکندرآبادی شعراء میں وفا سیتاپوری، محمود حسن عشق ہاپوڑی، نواب علی قہر اجمیری اور اختر الہ آبادی شامل ہیں۔

اکتوبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں "جولیس سیزر" اور "نیرنگ زمانہ" کی بقیہ اقساط کے علاوہ صرف ایک خاص مضمون عبدالغفار اختر الہ آبادی کا ہے جس میں افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ایک غزل پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ اختر کا مضمون اس تمہید کے ساتھ شروع ہوا ہے:

"۱۰ ستمبر ۱۹۰۹ء کے رسالہ "مخزن" میں ایک غزل جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ایک مختصر تمہید کے ساتھ شایع ہوئی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس غزل پر سرکار مالیر کوٹلہ سے جناب شاعر کو ایک سو روپیہ انعام اور خلعت ملا۔ ہم کو جناب آغا شاعر کی اس کامیابی پر بہت خوشی ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے کہ "مخزن" سے معزز رسالے کا اظہار حسن عقیدت جناب موصوف کے ادعائے زبان دانی کے ساتھ مل کر کہیں لوگوں کو اس دھوکے میں نہ ڈال دے کہ جناب موصوف کا کلام کسی حد تک مسلم الثبوت ہے اور اس طرح دھوکے میں وہ لغزشیں جو جناب موصوف (آغا شاعر) سے وقوع میں آئی ہیں زبان اُردو کے اندر داخل نہ ہو جائیں۔"

یہ مضمون دراصل وفا سیتاپوری کا لکھا ہوا تھا مگر انھوں نے اسے عبدالغفار اختر کے نام سے شایع کر دیا تھا۔ مضمون کا انداز بیان تو کافی وزنی ہے، لیکن آغا شاعر پر جس قسم کے اعتراضات کئے گئے ہیں افسوس کہ ان میں کوئی خاص وزن نہیں ہے مثلاً آغا شاعر کے مطلع

چلے گا نہیں مجھ پر فقرا تمہارا　　اٹھا لو کہ خنجر ہے جھوٹا تمہارا

پر اعتراض کیا گیا ہے کہ "ہائے مختفی" کے قافیے ان قافیوں کے ساتھ نہیں آسکتے جن میں "الف" ہے۔ یعنی اس غزل میں "فقرا" کھیا، چہرہ، پردہ اور جنازہ کے جو قافیے نظم کئے گئے ہیں وہ "جھوٹا" کے ساتھ متروک ہو چکے ہیں۔ مضمون میں یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ قدیم اساتذہ کے یہاں اس قسم کے قوافی ملتے ہیں۔ آغا شاعر کے یہاں ایسے قافیوں کے استعمال کو قابل اعتراض قرار دیا گیا ہے۔ مطلع کے پہلے مصرعہ کی بندش پر بھی اعتراض کیا گیا ہے اور قدیم انداز تنقید کے لحاظ سے اس مصرعہ کی اصلاح کی گئی ہے۔

چلے گا نہ مجھ پر یہ فقرا تمہارا

غرضیکہ یہ سارا مضمون اسی قدیم اسلوب تنقید کا عکاس ہے جو اب سے نصف صدی ادھر رائج تھا۔ ویسے آغا شاعر کی غزل اپنے رنگ کی اچھی خاصی غزل ہے۔

آغا شاعر دہلوی اور وفا سیتاپوری کے گہرے تعلقات کی ابتدا اسی ادبی جنگ سے ہوئی تھی جو آگے چل کر ایک ایسی دوستی میں تبدیل ہو گئی جس نے ان دونوں کو یک جان و دو قالب کر دیا تھا۔ چند ہی سال کے بعد آغا شاعر کی شادی سیتاپور کے اسی خاندان میں ہوئی اور آغا صاحب مدت العمر سیتاپور آتے جاتے رہے۔ یہ خاندان تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلا گیا۔ آغا صاحب کی اہلیہ بقید حیات ہیں۔

نومبر ۱۹۰۹ء میں بھی "جولیس سیزر" اور "نیرنگ زمانہ" کے ترجموں کی اقساط شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جسٹس بدرالدین طیب جی پر عبدالغفار اختر کا مضمون کافی دلچسپ ہے۔ اس شمارے میں سب سے زیادہ اہم مضمون ایڈیٹر "یہ بیضا" کا "تنقید" ہے جس میں انھوں نے حسرت موہانی کا مدلل جواب دینے کی کوشش کی ہے جس میں حسرت نے مومن دہلوی کی بعض لغزشوں کا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ حسرت کا یہ مضمون جون ۱۹۰۹ء کے "اردوئے معلی" میں شایع ہوا تھا ایڈیٹر "یہ بیضا" نے لکھا ہے:۔

"ماہ جون ۱۹۰۹ء کے "اردوئے معلی" میں ہمارے ہم عصر جناب حسرت موہانی ایڈیٹر رسالہ مذکورہ کا ایک مختصر مضمون مومن خاں مرحوم کے متعلق ہماری نظر سے گزرا۔ واقعی ہم عصر نے جو کچھ فیصلہ مومن خاں کی شاعری کی نسبت کیا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ مضمون زیادہ احتیاط سے نہیں لکھا گیا ہے۔ معزز ہم عصر کے شبہات آج کل کی زبان کے لحاظ سے قابل وقعت ہوں تو ہوں؛ مگر مومن خاں کے زمانے تک اس قسم کے شبہات کو دل میں جگہ دینا اپنی عدم واقفیت کا اظہار کرنا ہے؛ کیونکہ ان کے تمام ہم عصر شاہ نصیر، ذوق، غالب، ناسخ، آتش وغیرہم کے دواوین کی سیر کرنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی باتیں اس وقت نقائص شعری میں داخل نہ تھیں۔"

اس مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس مضمون کی افادیت پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑ جائے گی۔

اس کے بعد ہم عصر (حسرت موہانی) منجملہ بہت سی لغزشوں کے چند لغزشیں گناتے ہیں مثلاً:۔

اے محتسب نہ توڑ تو شیشے کو دیکھنا - آتی ہے مجھ کو سنگدل دشمن کی یاد　(مومن)

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ہماری زبان

۱۵ر دسمبر ۱۹۶۲ء

غالب سنٹنری کے لئے ادبی کام

غالب سنٹنری کمیٹی کی تین دسمبر کی نشست میں یہ طے ہوا کہ
ے ادبی ادارے، یونی ورسٹیوں کے اُردو کے شعبے اور
کے ادبی مراکز غالب پر جو ادبی کام کر سکیں" اُن کا ایک
عدہ منصوبہ بنایا جائے، تاکہ تمام ضروری پہلوؤں پر
ہو سکے اور کوئی اہم اور ضروری گوشہ چھوٹ نہ جائے۔
لسلے میں انجمن نے بھی ایک پروگرام بنایا ہے جو اس کی
یٹی میں پیش ہوگا۔ ساہتیہ اکاڈمی کو بھی توجہ دلائی جائیگی
کام کا ایک پہلو اپنے لئے مخصوص کرے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ
ب اپنے طور پر غالب کے سلسلے میں کچھ تحقیق کر رہے ہوں۔
و شری احمد محی الدین سکریٹری غالب سنٹنری کمیٹی سے اتعلق رکھ
ری سے اس سلسلے میں خط و کتابت کرلیں تو بہتر ہوگا۔
ں ایڈیٹر ہماری زبان کو بھی مطلع کردیں تو کام میں
لت رہے گی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں بڑے پیمانے پر جلسے
ں گے، لیکن یہ چیزیں اتنی ضروری نہیں جتنا غالب
کلام کے انتخابات ہندوستان کی ساری زبانوں اور
ں خاص خاص زبانوں میں پیش کرنا اور اُن کی اچھی
ح عمری اور اُن پر ایک جامع تنقید منظرِ عام پر لانا۔
غالب کے دور پر ابھی بہت سا مواد ایسا ہے جو پردہ
میں ہے، اسے بھی سامنے لانا ہے۔ اُردو کے ادبی
روں، محققوں اور نقادوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اُردو زبان
اس بہت بڑے شاعر اور نثر نگار اور جامع شخصیت
ان کی عظمت کو ساری دُنیا پر روشن کردیں۔ ٹیگور کی
ئش کی جو صد سالہ یادگار ہندوستان میں اور دُنیا
منائی گئی تھی اُس سے نہ صرف اس شاعرِ اعظم کی عظمت
پر واضح ہوئی، بلکہ ایک طور پر قومی وحدت کا کام بھی
ے بڑھا۔ ہمیں یقین ہے کہ غالب کے جواہر پارے اگر
ہندوستان کی تمام زبانوں میں منتقل ہوں گے تو اس سے
صرف غالب کی عظمت کا نقش گہرا ہوگا، بلکہ ہندوستانی
یب کی بنیادی وحدت اور ہندوستانی ادبیات کی
ت بھی نمایاں ہوگی۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

"میاں دانی"

ڈاکٹر غلام یزدانی دہلی کے رہنے والے تھے مگر حیدرآباد میں رس بس گئے تھے۔ اُردو دنیا نے پہلے پہلے انھیں فرحت اللہ بیگ کے مضمون "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی" سے جانا۔ فرحت اور میاں دانی نے نذیر احمد سے عربی پڑھی تھی۔ فرحت منھ پھٹ تھے اور "دانی" متقطع، مگر دونوں میں بڑا میل جول تھا۔ میاں دانی نے حیدرآباد کے محکمہ آثارِ قدیمہ میں جان ڈال دی۔ انھیں کی کوششوں سے اجنتا کے غاروں کے متعلق کئی کتابیں اور البم تیار ہوئے اور ان غاروں کو ان کی اصلی صورت میں محفوظ رکھنے اور موسم اور وقت کے اثر سے بچانے کے لئے مناسب قدم اٹھائے گئے۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں انھیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری دی گئی تھی۔ دکن کی تاریخ پر بھی انھوں نے قابلِ قدر کام کیا تھا اور وہ ملک کے مسلّم ماہرین آثارِ قدیمہ اور مورخوں میں سے تھے۔ "یادگارِ فرحت" کے نام سے انھوں نے اپنے دوست فرحت اللہ بیگ کے نہایت اچھے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ ادبی رسالوں میں علمی و ادبی موضوعات پر ان کے مضامین بھی نکلتے رہتے تھے۔ اُردو مجلس کی ادبی سرگرمیوں کے بھی وہ روحِ رواں تھے۔ اُن کے دم سے ہماری قدیم تہذیب کی آبرو تھی۔ اُن کی ہر بات میں عالموں کی شان تھی۔ وہ بڑے منکسر مزاج تھے اور ہر علمی و ادبی کام میں مدد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کچھ عرصے سے بینائی میں فتور آجانے کی وجہ سے اور عام صحت خراب ہونے کی وجہ سے وہ معذور سے ہوگئے تھے، مگر لکھنے پڑھنے کا سلسلہ پھر بھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر غلام یزدانی کے انتقال سے ہماری صفوں میں بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے کام کئے۔ انھوں نے نہایت خاموشی سے علم و فن کی خدمات کا ایک پہاڑ کھڑا کردیا۔ کاش ہم میں اور بھی ایسے اشخاص ہوتے یا اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہی نمایاں تعداد میں ہوتے۔

انجمن ترقی اُردو جودھپور

۱۸ر نومبر کو ساہ گوردھن لال صاحب کابرا کے مکان پر انجمن ترقی اُردو جودھپور کا جلسہ ہوا جس میں گزشتہ جلسے کی روداد سکریٹری نے پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد ایک تجویز میں چین کی جارحانہ کارروائیوں پر اظہارِ نفرت کیا گیا اور طے پایا کہ ایک مشاعرہ مناسب وقت پر منعقد کیا جائے جس میں شعراء سے درخواست کی جائے کہ چین کے خلاف پرجوش نظمیں سنائیں۔

(وحید الدین خاں سکریٹری)

انجمن ترقی اُردو نوگانواں سادات

انجمن ترقی اُردو نوگانواں نے قصبہ میں تعلیم بالغان کے چھ شبینہ اسکول کھول دئے ہیں جن میں کافی تعداد میں طالب علم پڑھ رہے ہیں اور ۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء سے پورے قصبہ میں ہر محلہ کے حساب سے دس اسکول ہو جائیں گے جن کے لئے چھ ماسٹر اور ایک سپروائزر مقرر کیا جائے گا۔ انجمن ترقی اردو نوگانواں نے یہ تجویز پاس کی ہے کہ ایک ماسٹر کی تنخواہ بیس روپے ماہوار ہونی چاہیے اور سپروائزر کی چالیس روپے۔ ابھی تک گورنمنٹ سے کوئی امداد نہیں مل سکی ہے کوشش جاری ہے۔ کلاسوں میں پڑھنے والوں کے لئے تمام سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ انجمن تمام شاخوں اور تمام ہمدردوں سے اپیل کرتی ہے کہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں وہ ہر ممکن امداد کریں۔ اگر انجمن کی شاخیں دو تین ماہ تک کم سے کم پانچ روپے مہینے کی بھی امداد کریں تو ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ پانچ روپے بہت حقیر رقم ہے۔ ابھی صرف چار ماسٹر بغیر تنخواہ پڑھا رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ انجمن ترقی اُردو کی تمام شاخیں اور مرکزی انجمن ہماری امداد فرمائے گی۔

نسیم فاطمی سپروائزر، سوشل ایجوکیشنل کمیٹی
انجمن ترقی اُردو ہند شاخ نوگانواں سادات (ضلع مراد آباد)

انجمن ترقی اُردو شاخ ہری ہانسی

۱۵ر نومبر ۱۹۶۲ء کو گاندھی لائبریری کے ہال میں جناب ضمیر گیتہ ہری ہانسی کی صدارت میں انجمن کا ایک جلسہ ہوا جس میں مئی ۱۹۶۲ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۶۲ء تک کی کارگزاری کا جائزہ لیا گیا۔

صدر جلسہ نے دوران تقریر میں بتایا کہ بہت جلد انجمن "تاریخ الہری ہانس" مصنفہ جناب محمد ذکی چودھری مرحوم مولف مشکور ہری ہانسی، کتابی شکل میں پیش کرے گی جس سے اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔

صدر نے اپنی تقریر میں اس بات پر بہت زور دیا کہ آج اُردو کے لئے مادر وطن کی خدمت کا بہترین موقع ہے۔ اُردو کے ادبا، شعراء، فضلاء و علماء کو چاہیے کہ قوم کے تحفظ و بقا اور آن و عزت کے لئے پُر تاثیر، انقلاب انگیز اور ولولہ خیز نظمیں، مضامین اور مقالے لکھ کر ان کی گرمی سے وطن کے نوجوانوں اور جاں نثاروں کی رگوں میں خون کی لہریں تیز کر دیں اور یہ ثابت کر دیں کہ ماضی کی طرح آج بھی ادب اُردو قوم و ملک کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے۔

(صدر انجمن ترقی اُردو شاخ ہری ہانسی)

انجمن ترقی اُردو بودھن

انجمن ترقی اُردو شاخ بودھن (شکر نگر) کی جانب سے ۲۵ر نومبر کی شب میں ایک ادبی جلسہ زیر صدارت جناب حافظ رفیق احمد صاحب منصف منعقد ہوا۔

صاحب صدر کے علاوہ شبیر علی شاہد، نصرت علی ... ابن عزیز اور غفور مدنی نے مضامین و افسانے سنائے ... اس کے بعد بیت بازی ہوئی۔ یہ دلچسپ محفل رات گئے ... برخاست ہوئی۔

(معتمد انجمن)

بزم ادب اُردو کالج کی ادبی محفل

حیدرآباد، ۱۷ر دسمبر ۶۲ء کو بزم ادب اُردو کالج کی ... سے ایک اُردو مجلس محترمہ فاطمہ عالم علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ساجدہ عظیم اور رشید النساء نے افسانے سنائے ... شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ جناب مغنی تبسم صاحب مشیر بزم نے ادبی محفلوں کی اہمیت اور افادیت پر تقریر فرمائی۔ صدر جلسہ نے صدارتی تقریر کے علاوہ اپنا دلچسپ مزاحیہ مضمون "دعا گو" ... سنایا۔

(ارشاد علی خاں، منتظم انجمن ترقی اُردو)

ہائی اسٹینڈی سرکل (شعبۂ ادب) کا ماہانہ اجلاس

حیدرآباد، ہائی اسٹینڈی سرکل کے شعبۂ ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس ... ۱۶ر دسمبر کو منعقد ہوا۔ سید محمد حسن صاحب نے جلسے کی صدارت کی۔ ڈاکٹر سید اختر احمد نے "فلسفۂ موت و حیات" کے عنوان سے معلومات آفریں تقریر کی۔ اس سے پہلے ماہر آثار قدیمہ سید ابو ظفر غلام یزدانی کی رحلت پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔ اکثر شعراء نے چین کے جارحانہ حملے کے تعلق سے اپنی نظمیں پیش کیں۔ (ابن ناصر)

بزم ادب رتلام کے جدید انتخابات

یکم دسمبر ۱۹۶۲ء کو بزم ادب رتلام کے اراکین کا ایک ہنگامی جلسہ آئی۔ لال طبورہ صاحب زاہد کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں عہدے داروں اور ممبران مجلس ... کا انتخاب عمل میں آیا۔ (عبد السمیع سعید رتلامی)

بزم ادب باڑی (بھوپال)

بزم ادب باڑی کی جانب سے ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی۔ مشاعرے میں ایک تجویز کے ذریعے ہند کی سرحد پر چینیوں کے شرمناک و جارحانہ حملے کی شدید مذمت کی گئی اور مادر وطن کی حفاظت کے لئے ہر قربانی پیش کرنے کو تیار رہنے کا عہد کیا گیا۔ (شوکت جلالی)

جگن ناتھ آزاد

محسن کش و احسان فراموش

کل رات میں آزاد اداس فکر میں گم تھا
اس سلسلۂ زیست میں کیا نیش ہے کیا نوش
بیگانۂ احساس مروت جو ہے اتنا
ہمسایہ مرا آج ہے باہوش کہ بے ہوش
کیا بات ہے کیوں بھول گیا ہے مرے احساں
وا جس کے لئے میری محبت کا تھا آغوش
ناگاہ صدا آئی یہ خاموشی شب سے
اور چہرۂ افسردہ ہوئے شاعر غم کوش
حاصل جو بصیرت ہے تو فردا پہ نظر رکھ
آئینۂ اقوام زمانہ ہے مرا دوش
اُس ملک کا انجام زمانے پہ ہے ظاہر
جو ملک ہے محسن کش و احسان فراموش

ناظم سیوانی سہسرامی

رقص فطرت

ناچتے تھے ہم زمیں پر ایک دن
اور تماشا میں تھے سیارے تمام
آج الٹ کر وہ بساط زندگی
بزم نو کا کر چکے ہیں انتظام
آدمی ہے اب ہوا سے تیز رو
بے لگام و باعنان و تیز گام
ہے کشش کا راز بھی معلوم ہی
اور شعاع مہر ہے ادنیٰ غلام
یہ فضا کی وسعت موہوم بھی
فکر و فن کے دست حکمت سے ہے رام
رفعت افلاک بھی پامال ہے
ہے جہاں تاروں کا ہر سو ازدحام
بزم انجم میں ہے سیاروں کا رقص
آنکھ کی جنت ہے یہ دار السلام
رقص میں ہیں وہ مہ و خورشید بھی
جن کے آنچل میں ہے پنہاں صبح و شام
چھا گیا یہ رقص فطرت چھا گیا
زندگی کے زیر و بم پر چھا گیا

(۲)

رقص کی جھنکار کی موسیقیت
گنبد افلاک میں ہے گونجتی
بربط و عود و طبل و چنگ و رباب
تال، سُر، سرگم، سرود سرمدی
ایک ہنگامہ ہم آہنگی کا ہے
اک ہجوم دل کشائے نغمگی
وہ تبسم، وہ ترنم، وہ ادا
چھم چھما چھم، چھم چھما چھم مشتری
ہے کوئی رقاصۂ فطرت یہاں
جس کے پیچھے دوڑتی ہے زندگی
فطرت معصوم خود ہے رہنما
ہاتھ میں لے کر چراغ آگہی
یہ جہاں معمور ہے افکار سے
ہر قدم پر علم کی ہے روشنی
رقص و نور و نغمہ کی اس بزم میں
میرے دل کا زیر و بم ہے سرمدی
حسن فطرت کا ہے جب یک رقص عام
آدمی کے آج کو میرا سلام

کرشن موہن

ایک مختصر نظم

درختوں کے نیچے یہ بکھرے ہوئے زرد پتے
یہ پژمردہ اور سرد پتے
گزشتہ جوانی کے بے رنگ ارماں
نہیں جن کے اندوہ کا کوئی درماں
ہمارے غموں کی کہانی
سناتے ہیں افسردہ پتے حزیں خامشی کی زبانی

غزلیں

شمر انصاری نکاسادی

اب نہ زلف یار کی باتیں کرو
ہاں رسن اور دار کی باتیں کرو
چھوڑ دو اب قصۂ باغ و بہار
خار و نوک خار کی باتیں کرو
اب نہیں ہے وقت ذکر صلح و امن
دوستو! پیکار کی باتیں کرو
ابرو و مژگاں کے بدلے شہر میں
تیر اور تلوار کی باتیں کرو
دل میں جو بھر دے جواں مردی کا جوش
ہم سے اس گفتار کی باتیں کرو

شوق اثری

وہی طرف جو اٹھے گی نگاہ لطف و کرم
قریب گردش دوراں ملے گا تیرا حرم
وہ آ گئے تو نظر بھی نہ اٹھ سکی ہم سے
کریں گے شکوۂ بیداد سوچتے تھے ہم
ابھی تو شام بہار اور گل کھلائے گی
ابھی سے شوق نہ ہو شمع گلستاں مدھم

معین کوثر

سبق پڑھا گئے اہل وفا کو آج دنیا نے
فسانہ ہو گئے مہر و وفا کے افسانے
وہ دل کی خوشی ان سے امید تھی کیا کیا
نظر ملاتے ہیں وہ ہو گئے ہیں بیگانے
بس ایک بجلی سی تقصیر محبت کے عوض
ادا کیے دل کو شرمانے کتنے جرمانے

ابو محمد سید علی ساجد

چند تلامذۂ داغ

حضرت امیر خسرو (۱۲۰۰ تا ۱۳۲۵ء) سے لے کر داغ دہلوی تک جس قدر شعرائے اُردو گزرے ہیں ان کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو صرف مصحفی ہی کی ایک ایسی شخصیت نظر آئے گی جس نے کثیر تلامذہ ہونے کے علاوہ اپنے ادبی سرمائے میں آٹھ دواوین اور ایک مبسوط تذکرہ چھوڑا ہے۔

اس اُستاد کامل کے بعد اگر کسی اُستاد پر نظر پڑ سکتی ہے تو وہ داغ دہلوی ہیں جن کے تلامذہ بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔

ان مشاہیر اُردو نے اُردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کو دنیائے ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

بعض ارباب نثر اُردو نے حال ہی میں مصحفی، غالب اور ذوق کے تلامذہ کو اکٹھا کر دیا ہے۔ ادبی ذوق رکھنے والے آسانی کے ساتھ ان کے ادبی کارناموں سے متعارف ہو سکتے ہیں۔

آج ہم بھی اپنے اُردو دوستوں کے سامنے تلامذۂ داغ کے ادبی کارنامے پیش کریں گے۔

فروغ حیدر آبادی

محمد عبد الولی نام اور تخلص فروغ نسباً فاروقی تھے یہ محمد عباس وکیل کے اکلوتے صاحبزادے تھے جو (۱۲۹۶ھ) کوچہ لال ابلی محلہ شہدی محبوب سبحانی حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور (۱۹۳۰ء) میں انتقال کیا۔ پل مسلم جنگ کے نیچے جو قبرستان دال منڈی سے موسوم ہے مدفون ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کرنے کے بعد یہ حیدر آباد کی قدیم درس گاہ علوم مشرقیہ دار العلوم میں شریک ہو کر اُردو فارسی اور عربی میں کافی دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مختلف اساتذہ کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے رہے اور حیدر آباد کے مختلف دفاتر کروڑ گری امداد باہمی سررشتہ مال اسٹیٹ مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی میں ملازمت اختیار کی تھی، لیکن ایک آزاد منش شخصیت نے قید و بند کی زندگی کو پسند نہیں کیا اور بہت جلد حضرت فروغ نے ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی محلہ جنبلی پورہ میں مستقل سکونت رکھتے تھے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک شاعر اور ادیب کو شہرت اس کی زندگی میں نصیب نہیں ہوتی لیکن فروغ مرحوم اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے راقم السطور نے اپنے بچپن میں اکثر لوگوں کی زبانی اور قوالی کی محفلوں میں ان کی غزلیں گاتے سُنا ہے۔ بالخصوص حیدرآباد کے گلی کوچوں میں ان کے کلام کی دھوم تھی۔ مجھے اس وقت بھی ان کا یہ شعر یاد ہے۔

دل بہت بے چین ہے لے دلربا تیرے لئے
مٹ گیا تیرا فروغ مبتلا تیرے لئے

جن اساتذہ سے فروغ مرحوم نے استفادہ کیا ان میں نوازش علی لمعہ، حافظ شیخ محی الدین محفوظ حیدر آبادی، مظفر الدین معلی جہاں اُستاد حضرت داغ دہلوی ہیں۔

اصناف شاعری میں فروغ مرحوم کو غزل بہت پسند تھی اس لئے فروغ نے غزل ہی میں اپنا جوہر دکھایا۔ آپ کا رنگ اپنے اُستاد سے بہت ملتا جلتا ہے۔ غزل میں زبان کی چاشنی روزمرہ کا استعمال اور مضمون آفرینی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات تھیں یہی وجہ تھی کہ فروغ مرحوم تلامذہ داغ میں ممتاز مانے جاتے تھے جس کی وجہ سے ان کی غزل کو عوام اور خواص دونوں نے پسند کیا۔

فروغ مرحوم کے شاگردوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ان کے دیگر شاگردوں میں امام الغزل صفی اورنگ آبادی، قاضی محمود عبد القدیر، عبد الحمید خاں خیالی، نظام الدین عارف، حافظ ابو النعیم عیش، شیخ صالح المصلی جامی، محمد فخر الدین عالی، محمد داؤد، مرزا شیخ محمد افسر مرحوم قابل ذکر ہیں۔

نمونۂ کلام:-

یہی عالم رہے جو فرقت کا بُت بنا لیں گے تیری صورت کا

تم نہ الٹو نقاب چہرے سے
دل الٹ جائے گا زمانے کا

فروغ آتی ہے اب کہتے ہوئے شرم کہ مجھ سے دوستوں نے دشمنی کی

ہمارے خانۂ دل میں کبھی تشریف لائے بھی
کہا کرتے تھے آئیں گے کسی دن آپ آئے بھی

اے بے نیاز جس کو جو چاہا بنا دیا
دینے پہ تو جو آئے تو تیرے ہزار ہاتھ

نہ نماز آتی ہے مجھ کو نہ وضو آتا ہے
سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

مانند اشک کوئی اُٹھاتا نہیں ہمیں
کچھ ایسے گر گئے ہیں تمہاری نگاہ میں

کون سی مانی نہ منت کون سی چھوڑی دعا
بُت تلک سجدہ کیا او بے وفا تیرے لئے

ہوش آتے ہی ملا تا تھا ہمیں کو خاک میں
کیا اسی دن کے لئے کی تھی دعا تیرے لئے

یاس ہوتی ہے غم جاناں کی کیا کم بخت یاس
رہ گئی تو جان لی نکلی تو رسوائی ہوئی

دشمن کے خوف سے وہ گلے میرے لگ گئے
نازک سا دل اُچھلنے لگا چار چار ہاتھ

اپنے ہی شعر و سخن سے اے فروغ
حیدر آباد دکن کا نام ہے

کسی کے جلوے دیکھے ہیں نگاہ پاسباں ہو کر
کسی کے پاؤں چومے ہم نے سنگ آستاں ہو کر
کسی کی خاطر نازک کا میں کانٹا نہیں تنہا
کسی کی بزم میں رہتا نہیں بار گراں ہو کر
فروغ حیدرآبادی بھی اک چلتا ہوا نکلا
زمانے کو مسخر کر لیا جادو بیاں ہو کر

ہے ترقی پر مرا درد جدائی اور بھی
اور بھی اے بے وفا کر بے وفائی اور بھی
ہونے پایا تھا ابھی خوگر نہ درد ہجر کا
آگ رشک غیر نے دل میں لگائی اور بھی
دیکھ لے مڑ کر نگاہ ناز کے قربان میں
ایک بار اے فتنہ گر جلوہ نمائی اور بھی
فائدہ کیا ایسے ہرجائی سے ملنے میں فروغ
ہو گی دنیا میں تمہاری جگ ہنسائی اور بھی

صولت حیدرآبادی

صولت تخلص، ابوالمظفر حافظ محمد عبدالعزیز نام، (۱۸۹۱ء) حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ یہ محمد عبدالکریم کے فرزند تھے، جو حیدرآباد کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نو سال کی عمر میں یہ حافظ کلام ربانی ہونے کے بعد حیدرآباد ہی کی ایک قدیم درس گاہ دارالعلوم سے مولوی عالم اور مولوی فاضل ہوئے دفتر معتمدی پرائیویٹ سیکرٹری حضور نظام میں صیغہ داری پر مامور ہو کر وہیں سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

یوں تو آپ کو ابتدا ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا ابتدا میں چند غزلیں حافظ شیخ محی الدین محفوظ حیدرآبادی کو دکھائیں جب حیدرآباد میں استاد داغ تشریف لائے تو ان سے شرف شاگردی حاصل کیا۔

یوں تو صولت مرحوم نے شاعری کے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا محبوب ترین موضوع اردو غزل تھا۔ ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بلا کے زود گو تھے تاریخ گوئی میں یدطولیٰ رکھتے تھے آپ کا کلام سحائب پاک و صاف اور محاسن کا آئینہ دار ہے۔ بالخصوص غزل میں تو صولت مرحوم نے اپنے استاد مرحوم کی پوری پوری تقلید کی ہے۔

صولت مرحوم کی زود گوئی کی ایک معمولی مثال یہ تھی کہ چند سال کی فکر میں ایک دیوان مکمل کر لیا تھا۔ حیدرآباد میں (۱۳۲۶ھ) میں جو طغیانی ہوئی اُس میں آپ کا بہت سا اثاث البیت اور اپنا فکری سرمایہ بھی غرقاب ہو گیا۔ اس دیوان کے یوں ضائع ہو جانے سے صولت کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ پھر انہوں نے اپنا کلام جمع رکھنا ہی ترک کر دیا۔ دوست احباب کے اصرار پہ جب کوئی غزل ہو جاتی تو کسی رسالے یا گلدستے میں شائع ہو جایا کرتی تھی۔ البتہ حضرت منشی میر امداد علی علوی المتوفی (۱۳۲۰ھ) کے عرس کے موقع پر جو مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے ان مشاعروں میں آپ کے پابندی سے ساتھ پڑھنے کے باعث اکثر غزلیں ایسے مشاعروں کے گلدستوں بزم رندان اور محبوب الکلام میں شائع ہوئی ہیں۔

صولت مرحوم ایک قدیم وضع کے بزرگ تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے آپ نے مغربی تہذیب اور فیشن پرستی کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ انہوں نے اکبر الہ آبادی کے رنگ میں بھی اکثر قطعات اور نظمیں کہی ہیں

ہم ذیل میں ان کا ایک قطعہ پیش کر رہے ہیں ملاحظہ ہو۔

طرز اپنی چھوڑ دی نیو فیشنی کی اختیار
پیٹ بھر آرام سے ملنے لگیں جب روٹیاں
دی یہ صولت ان کو فیشن کی عدالت نے سزا
کٹ گئیں مردوں کی مونچھیں عورتوں کی چوٹیاں

صولت مرحوم کے انتقال سے قبل اور انتقال کے بعد بھی اکثر و بیشتر تذکرے مرتب و شائع ہو چکے ہیں لیکن کسی میں بھی ان کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام نہیں ملتا۔

(۱۳۵۰ھ) میں انتقال کیا بیرون دریچہ ماتا حیدرآباد میں مدفون ہوئے۔ صولت مرحوم کے چھوٹے بھائی محمد فخرالدین عالی راقم السطور کے استاد بھائی ہیں۔ ہم بھائی عالی کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے محترم بھائی کے حالات زندگی سے ہمیں واقف کرایا اور نمونۂ کلام بھی مرحمت کیا۔

نمونۂ کلام :-

فقط تم ہی نظر آتے نہیں خواہان جاں مجھ کو
دکھاتی ہے تمہاری تیغ بھی سوکھی زباں مجھ کو
ہوئی ہیں باعث تسکین دل ناکامیاں مجھ کو
خیال یار و شوق وصل اب صولت کہاں مجھ کو
مجھے برباد کر کے کیا زمیں کو چین آئے گا
کبھی راحت نہ پائے گا ستا کر آسماں مجھ کو
دل پُر شوق کے ارماں ٹھکانے سے لگا دیتا
ملی ہوتی محبت میں جو عمر جاوداں مجھ کو

صولت خدا بچائے تجھے دست عشق سے — اس کم سنی میں کیسا یہ آزار ہو گیا
چوٹی کو تیری دیکھ کے دھوکے میں سانپ کے
چاروں طرف سے شور اُٹھا مار مار کا

[illegible]

مراسلات

بیخودؔ بدایونی کی سوانح حیات

ہماری زبان ۲۲ر مارچ ۱۹۶۲ء میں بذریعہ مراسلہ حضرت عبدالحیٔ صاحب بیخودؔ بدایونی مرحوم کی مختصر سوانح حیات معلوم کرنے کے لئے ارباب ادب سے گزارش کی گئی تھی مگر ہنوز کسی صاحب نے توجہ نہیں فرمائی۔

اس لئے مکرر عرض ہے کہ مجھے بیخودؔ بدایونی کا سنہ پیدائش اور وفات، ان کی تصانیف کے عنوان اور تاریخ اشاعت، نیز بیخودؔ صاحب کی زندگی کے مجملاً حالات کی اشد ضرورت ہے۔

براہ کرم واقف کار حضرات اس طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائیں۔

(خاورؔ - جبل پوری)

سکندر نامۂ بحری

نظامی نے اپنی شاہکار مثنوی سکندر نامے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کا نام سکندر نامۂ بری اور دوسرے کا سکندر نامۂ بحری ہے مطبوعہ متداولہ سکندر نامۂ بری میں تاریخ تصنیف منضبط نہیں جبکہ سکندر نامۂ بحری میں حسب ذیل اشعار سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ؎

بہ پایاں شد ایں داستان دری	بہ فیروز فالی و نیک اختری
زہجرت جہاں برد ہم یادگار	نود نہ گذشتہ زپانصد شمار[1]

چنانچہ مولانا شبلی نے شعر العجم میں انہی اشعار سے استناد کرکے سکندر نامے کے خاتمے کی تاریخ ۵۹۹ھ تحریر کی ہے۔[2]

کتب خانۂ راقم سطور میں سکندر نامۂ بری کا ایک قلمی نسخہ "عبدالجلیل" کا تحریر کردہ محفوظ ہے جو ۲۳۳ اوراق (۴۶۶ صفحات) پر مشتمل ہے۔ اس میں اور مطبوعہ متداولہ نسخے میں کہیں کہیں اختلاف ہے۔ نسخۂ پیش نظر کی تاریخ تحریر "بست و چہارم ماہ صفر ختم اللہ بالخیر والظفر سنہ ۱۰۹۹ھ جلوس اورنگ شاہ بست" نسخے کے آخر میں ثبت ہے۔" مدح نصرۃ الدین" مطبوعہ و قلمی دونوں نسخوں میں موجود ہے لیکن نسخۂ پیش نظر میں سلسلہ مدح حسب ذیل اشعار بھی مرقوم ہیں۔ ؎

بگفتم من ایں نامہ را در جہاں	کہ تا دور آخر بود بر شہاں
بتاریخ پانصد نود ہفت سال	کہ خوانندہ را زو نگیرد ملال
سہ سال چہارم محرم بدست	زساعت گزشتہ چہارم بدست

یہ مدح قلمی نسخے میں ۳۹ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ ان کے ۳۴، ۳۵ اور ۳۶ ویں شعر کی نقل کی گئی ہے کہ ان کا شعر ثانی سکندر نامۂ بری کی تاریخ تصنیف ۵۹۷ھ کا مظہر ہے۔ نیز یہ کہ کتاب بآغاز شروع سال میں چوتھی محرم کو چار گھڑی دن چڑھے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

نظامی کی تاریخ وفات دولت شاہ سمرقندی نے سنہ ۵۹۶ھ اور مولانا جامیؒ نے سنہ ۵۹۲ھ بتائی ہے۔[3] جو ۵۹۷ھ اور ۵۹۹ھ دونوں کے منافی ہے۔ معلوم نہیں کہ مادی شہادتوں کے باوجود ان بزرگوں سے یہ تسامح کیونکر عمل میں آگیا۔

نظامی نے سکندر نامۂ بحری کے اشعار مندرجہ ذیل میں اپنی عمر وقت تصنیف کتاب ۶۳ سال چھ ماہ کی بتائی ہے۔ ؎

نظامی چو ایں داستان شد تمام	بعزم شدن نیز برداشت گام
زبس روزگارے بریں سرگذشت	کہ تاریخ عمرش ورق در نوشت
فزوں بود شش ز شصت و سہ سال	کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال[4]

لہٰذا وقت تصنیف سکندر نامۂ بری ان کی عمر ۶۱ سال کی ہونی چاہئے۔

(معراج دھولپوری)

یار جامی سے رحمٰن جامی

"ہماری زبان" کے علاوہ بھی میں اب تک "یار جامی" کے قلمی نام سے ہندو پاک کے مختلف رسائل میں مضامین نظم و نثر لکھتا رہا تھا لیکن اب میں نے طے کیا ہے کہ "یار جامی" کے بجائے آئندہ "رحمٰن جامی" کے اپنے اصلی نام سے ہی مضامین نظم و نثر لکھا کروں گا۔

(رحمٰن جامی)

یہ شعر کس کا ہے؟

اگر بخشے زہے قسمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

قارئین ہماری زبان میں سے اگر کسی صاحب کے علم میں مندرجہ بالا اشعار ہوں تو بتانے کی زحمت گوارا کریں۔ ممنون و مشکور ہوں گا۔

(ایم ۔ اے ۔ خاں)

مراٹھی شاعری پر اردو میں تالیف

مہاراشٹر کے نوجوان شاعر و ادیب جناب خاورؔ بانکوٹی ان دنوں مراٹھی شاعری پر اردو میں ایک کتاب تالیف کر رہے ہیں، موصوف اس سلسلے کے دو مقالات لکھ چکے ہیں۔ شاعری کے بعد انہوں نے مراٹھی ڈرامے پر لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

(عثمان قاسمی)

---

[1] سکندر نامۂ بحری مطبوعہ نول کشور بار اکتوبر ۱۸۷۵ء

[2] شعر العجم جلد اول صفحہ ۲۹۵

[3] شعر العجم جلد اول صفحہ ۲۹۰

[4] سکندر نامۂ بحری مطبوعہ نول کشور صفحہ ۲۳ سنہ ۱۳۰۷ھ

اُردو ادیب و شاعر

انجمن ترقی اُردو کی دلی شاخ نے ۹ر دسمبر کو چینی حملے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ایک جلسہ منعقد کیا، اس میں دو صحافیوں نے تو صدر شاخ دلی پنڈت سندر لال جی کے باہر جانے پر اعتراض کیا جو اکتوبر میں آنکھ کا آپریشن کرانے کے لئے ماسکو تشریف لے گئے ہیں اور صدر جلسہ لالہ کرشام ناتھ صاحب نے فرمایا کہ انجمن ترقی اُردو کو ایسے ادیبوں اور شاعروں سے اپنے کو الگ رکھنا چاہیے جو ترقی پسندی کا دعویٰ کرتے ہیں، ان لوگوں کو اپنے ملک سے زیادہ بیرونی ممالک سے دلچسپی ہے، ایسے ہی ایک شاعر کی کتاب بھی حکومت ہند نے ضبط کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی ہمت افزائی بالکل نہ کی جائے جو قوم پرورانہ نقطۂ نظر نہیں رکھتے اس سے اُردو کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

لیکن کسی اُردو کے ادیب اور شاعر کے ذاتی کردار کا اُردو سے کیا تعلق ہے، یہ عجیب بات ہے کہ کسی اُردو والے کی ذرا سی لغزش تو قابل گرفت بن جاتی ہے اور نکتہ چیں اصحاب یہ بھول جاتے ہیں کہ جنگ آزادی میں اُردو کے ادیب اور شاعر جس طرح سیاسی رہنماؤں کے ساتھ رہے ہیں کسی اور زبان کو یہ فخر حاصل نہیں، گاندھی جی سے پہلے بھی ملک کی آزادی کے لئے ایک اُردو کا سربرآوردہ ادیب جیل میں گیا جس کو دنیا ابوالکلام کے نام سے جانتی ہے اور جو چکی پیسنے کے ساتھ مشق سخن بھی کرتا تھا وہ بھی اُردو کا شاعر ہی تھا، اور جس نے دار پر چڑھتے ہوئے کہا تھا "دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے" وہ بھی اُردو کا شاعر تھا اور اُردو ہی کی بہت سی نظمیں بھی ۱۹۴۲ء میں اپنے ولولہ انگیز پیغام کی وجہ سے انگریز گورنمنٹ نے ضبط کی تھیں۔ اب بھی اُردو کے ادیب اور شاعر چینی حملے کے خلاف اتنا کچھ لکھ رہے ہیں کہ اگر یہ سب جمع کیا جائے تو ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو جائے گا، یوں ہر فرقے اور ہر زبان کے بولنے والے مختلف خیالات کے ہوتے ہیں۔ اُردو کی طرح ہندوستان کے ہر زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسی نظمیں کچھ سال پہلے لکھی ہوں گی جو اس زمانے میں ٹھیک نہیں سمجھی جائیں گی، سمجھ میں نہیں آتا کہ اُردو بیچاری پر اتنی عنایت کیوں؟ انجمن ترقی اردو میں کام کرنے والے اپنے فرائض کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اپنے وطن اور قوم کے پورے وفادار ہیں البتہ ارباب حکومت کی خوشامد کرنا ان کا پیشہ نہیں۔

ہماری زبان

"ہماری زبان" میں جو نظمیں اور غزلیں چھپتی ہیں ان کا خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں، گزشتہ دو ایک سال سے دیکھنے میں آتا ہے کہ اُردو شاعری میں ہندی کے متعدد الفاظ کو جگہ دی جاتی ہے، اگر یہ اقدام اُردو اور ہندی کو ہم آغوش کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے تو مستحسن ہے۔ ادھر نظموں کی ہیئت میں تنوع پیدا کیا جا رہا ہے۔ اسلوب میں نئے تجربے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ مضامین میں بھی کہیں کہیں اچھوتا پن محسوس ہوتا ہے۔ یہ چیزیں مستقبل میں ترقی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اس کی ہیئت یا صورت میں فی الحال کسی تغیر کا امکان نظر نہیں آتا۔ البتہ ردیف قافیہ اور زبان میں جدتیں پیدا کر کے اس کو جامہ زیب کیا جا سکتا ہے اور پھر جاذب نظر بھی۔ آئے دن کے نئے مسائل اور نئے خیالات کو تغزل کے پیرائے میں اظہار کرنے کی کافی گنجائش ہے۔ مگر اب جو غزلیں شائع ہوتی ہیں۔ ۲۲ر نومبر کا شمارہ اس وقت خصوصی طور پر زیر نظر ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے گویا غزل گو شعراء اب تھک سے گئے ہیں۔ بیشتر غزلیں تین یا چار اشعار پر مشتمل ہوتی ہیں، اور وہ بھی عموماً چھوٹی بحریں۔ ان کو نغمے نہیں کہا جا سکتا بلکہ چٹکلے۔ کیا نغموں کو چھوڑ کر چھوٹی بحروں پر آ جانا ترقی ہے کہ تنزل یا یہ دور چھوٹوں کے لئے ہی ہے؟ اس صورت حال کی توجیہ کہیں شعراء کی زبوں حالی زندگی سے تو نہیں کی جا سکتی؟ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ پھر بھی یہ امر مسرت افزا ہے کہ یہ چھوٹے وقت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان میں روح عصر پائی جاتی ہے۔ محمد عرفان اور رحمٰن ساجد کے چھوٹے جن کو زیادہ پیارے لگتے ہیں اور دونوں کی یہ آوازیں زیادہ نمایاں ہیں ؎

اظہار تمنا کو الفاظ نہیں ملتے — جذبات کا جب دل میں طوفان مچلتا ہے

تیر سا قلب و جگر ہو تو غزل ہوتی ہے
غم کے طوفان میں بسر ہو تو غزل ہوتی ہے

افسر آغا لکھنوی کی غزل کو زیر نظر شمارے میں اولیت ملی ہے۔ شاید اس لئے کہ ان کے یہ اشعار چین کی جارحیت سے پیدا ہونے والے حقائق کے ترجمان ہیں ؎

ان کا گلہ کیا ہی جو پرائے — دھوکہ دے گئے جب اپنے سائے
اپنا اس کو سمجھا جائے — وقت مصیبت کام جو آئے
عالم الفت میں لٹ افسر — اکثر ہم نے دھوکے کھائے

یہ اشعار انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے غموں کی عکاسی کر رہے ہیں۔ یہاں آپ بیتی اور جگ بیتی، یا یوں کہیے غم جاناں اور غم دوراں باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اور بھی چار شاعروں کی مختصر غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ ان میں بھی کہیں کہیں سے کی بات ملتی ہے مگر جس چیز کو غزل کہتے ہیں وہ اب شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

(شوریدہ کاشمیری)

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

چینی حملے کے خلاف دلّی کے ادیبوں اور شاعروں کا احتجاج

یکم دسمبر کو دلی کے ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کا ایک جلسہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ہارڈنگ لائبریری میں منعقد ہوا۔ لالہ شام ناتھ نائب وزیر اطلاعات و نشریات نے جلسے کی صدارت کی۔

صدر جلسہ نے فرمایا کہ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ایک پڑوسی ملک نے ہم پر حملہ کیا جس پر صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، جب سے یہ نئے حالات پیدا ہوئے ہیں ملک کی فضا بدل گئی ہے، اور اس سے ہمیں خوشی ہے کہ اب قومی ایکتا کی طرف سب فرقوں کا رجحان ہے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ آزادی کے بعد ہم یہ بھول گئے تھے کہ آزادی کا تحفظ سب سے زیادہ ضروری ہے، زبان کے سوال پر اور ریاستوں کی تنظیم کے سلسلے میں ماضی میں ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئیں جن سے ہندوستان کا سر نیچا ہوا، لیکن اب ان فضولیات کو چھوڑ کر ہم تیزی سے اتحاد کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہ صورت حالات اطمینان بخش ہے۔

ادیبوں اور شاعروں کو مخاطب کرتے ہوئے لالہ شام ناتھ نے فرمایا کہ حکومت ہند نے ہر طرح کوشش کی کہ چین کے ساتھ معاملات مصالحانہ طور پر طے ہو جائیں لیکن افسوس ہے ایسا نہیں ہوا۔ حالانکہ ہر موقع پر ہندوستان نے چین کو مدد دی لیکن چین نے اس امداد کا یہ بدلہ دیا کہ شرمناک طریقے پر ہم پر حملہ کر دیا اب ہندوستان کے تمام لوگ چین سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں سے ملک کے اندر ایک ایسا ماحول پیدا کریں جس میں ہر آدمی تن من دھن سے ملک پر نچھاور ہونے کو تیار رہے، آج ہمارا ملک ہم سے قربانی چاہتا ہے۔ یہ ہم سب کے لئے بڑی آزمائش کا موقع ہے۔ اس دور میں یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ کون شخص کس حد تک کمزوری کا شکار ہے یا ملک کے ساتھ غداری کرنا چاہتا ہے، بدقسمتی سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس دور میں بھی دوسرے ملک کی طرف دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے ساتھ ان کا رویہ وفاداری کا نہیں ہے۔ ادیبوں اور شاعروں میں بھی کچھ ایسے لوگ شامل ہیں جو خود کو ترقی پسند کہتے ہیں، ایسے موقع پر ان لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ ان حالات میں ملک کا ساتھ دے اور حکومت کی پوری طرح فرماں برداری کرے۔ ابھی پانچ روز قبل راجیہ سبھا میں مسٹر فرید الحق انصاری نے ایک صاحب کا تذکرہ کیا جن کی ایک نظم میں ماؤ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ چیز کس قدر ناقابل برداشت ہے خواہ کوئی کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ ہو اس قسم کی چیزوں کو ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جائے گا۔

لالہ جی نے فرمایا کہ دلی ایڈمنسٹریشن نے اس کتاب پر (شکست زنداں) تین چار سال قبل پابندی بھی لگائی تھی لیکن پابندی اس وقت لگائی گئی جب دوبارہ ہمارے ایک سوشل ورکر نے اس کی طرف توجہ دلائی۔

کسی زبان میں اگر ایسے لوگوں کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اس سے زبان کو نقصان پہنچے گا۔ انجمن ترقی اردو کے اراکین خاص طور پر اس چیز کو محسوس کریں۔ اس مصیبت کے وقت ہم سب نے پورے عزم کے ساتھ بڑی سے بڑی قربانی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے ملک کی فضا کو سازگار بنائیں۔

عبد الباقی صاحب نے ریزولیوشن پیش کیا، اس کی تائید بیگم انیس قدوائی، حکیم خلیل الرحمن نازؔ اور جمنا داس اختر نے کی۔

بیگم انیس قدوائی نے ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے فرمایا شاعروں ادیبوں کا قوم کے اخلاق بنانے میں بڑا حصہ ہوتا ہے اور آج ہر شاعر و ادیب کا عام فریضہ ہے کہ وہ ملک کو بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی اپنے تحریری کام سے تیار کرے۔ صدر محترم کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے بیگم قدوائی نے فرمایا کہ جس نظم کا ذکر کیا گیا وہ دس سال پہلے لکھی گئی تھی اور وہ وقت ایسا تھا کہ ہندوستان اور چین میں برادرانہ محبت کے دعوے تھے اس لئے کسی پرانی نظم کو لے کر اب اس کا بار بار ذکر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں، اگر اب کوئی ایسی چیز اردو والے لکھیں تو وہ قابل گرفت ہے۔

جمنا داس اختر صاحب نے ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے حکومت پاکستان کے کچھ خاص اخبارات کی طرف توجہ دلائی، اور ان پر پابندی کا مطالبہ کیا اور ترقی پسند شاعروں کی وطن دشمنی کی مذمت کی۔

ظفر پیامی صاحب نے مقالہ پڑھا۔ تلوک چند محروم، روش صدیقی، ساغر نظامی، جگن ناتھ آزاد، سلام مچھلی شہری، حکیم خلیل الرحمن نازؔ، رعنا جلی، رفعت سروش، نریش کمار شاد، بہار برنی، گلزار دہلوی، شاکر دہلوی، عشرت کرتپوری، خان غازی کابلی، ہیرا لال فلک، اور طالب دہلوی نے ولولہ انگیز نظمیں سنائیں۔

دبستانِ یدِ بیضا

اعتراض یہ ہے کہ "سنگ دل" معروف ہے۔ اب جب کسی کے ساتھ موصوف نہ ہو اس وقت تک اس سے موصوف مراد لینا قطعی غیر فصیح ہو۔ اس قبیل سے ایک شعر (داور) ایک مصرعہ اور بھی لکھتے ہیں۔

ایک ہی جلوہ پردہ میں ہوا سو ٹکڑے
جنہیں مہر جسے کہتے ہیں "کہاں" ہوگا

"مردہ شوخ" جو ہیوند گر ہیں ہوگا۔

ذیل: معترض کا یہ اعتراض ان کی زبان دانی اور وسعت معلومات پر تاریکی پردہ ڈالتا ہے کیونکہ ایسے الفاظ، حور وش، پری وش، حور شمائل، پری شمائل، مہروش، مہ وش، مہر شمائل، مہ شمائل، ماہ رو، دلبر، مہ رخ، خورشید رو، شمع رو، گل اندام، گل پیرہن، سنگدل وغیرہ اگرچہ صفت ہیں، مگر اپنے اپنے موقع پر ان سے مراد محبوب ہی ہوتا ہے، اور سمجھنے والا یہی سمجھتا ہے چنانچہ مرزا نوشہ لکھتے ہیں۔

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے   اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

یہاں مرزا غالب نے "مہ خورشید جمال" بالکل اسی طرح لکھا ہے جس طرح مومن خاں نے "سنگدل دل شکن"۔

اور ذوق لکھتے ہیں۔

نہیں جاتے اٹھائے ناز کاش ان کے عوض ہم سے
مری چھاتی پہ پتھر "سنگدل" دو چار بھاری سے

اور ناسخ لکھتے ہیں۔

باغباں اپنے گل و میوے سے رکھ خاطر جمع
میں تو مشتاق چمن میں ہوں چمن آرا کا

اس شمارے کے حصۂ نظم میں سکندرآباد کے اسی طرحی مشاعرے کی غزلیں ہیں "ید بیضا" جس کا بانی اور رکن تھا۔ اختر الٰہ آبادی، خوشتر سکندرآبادی، خنجر سکندرآبادی، منشی نندکشور طالب دہلوی، قیصر سکندرآبادی اور وفا سیتاپوری کے علاوہ اس میں سکندرآباد کے ایک ان پڑھ شاعر "سیندھو خاں مفتوں" (روغن گر) کا بھی ایک مطلع دیا گیا ہے۔

اگر وہ جان جاں مانگے تو حاضر اپنی جان تک ہے
ارادہ دیکھنا ہے اس جفا جو کا کہاں تک ہے

دسمبر ۱۹۰۵ء میں "ید بیضا" کی پہلی جلد ختم کر دی گئی حالانکہ پہلے سال کا یہ چوتھا ہی شمارہ تھا۔ فہرست مضامین ملاحظہ ہو۔

۱۔ محمڈن یونیورسٹی	عماد الملک ڈاکٹر سید حسین بلگرامی (ترجمہ ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو)
۲۔ ایشیا اور یورپ کا مقابلہ	معشوق حسین خاں
۳۔ شراب خواری	مولوی ذکاءاللہ خاں دہلوی
۴۔ غزل	سائل دہلوی
۵۔ جولیس سیزر	عبدالغفار خاں اختر الٰہ آبادی (چوتھی قسط)
۶۔ فرنگ زمانہ	قاضی معین الدین سکندرآبادی (انگریزی ناول کا ترجمہ دو اقساط چھپ چکی ہے)
۷۔ غزلیات طرحی ...	
۸۔ غزلیات غیر طرحی ...	

"محمڈن یونیورسٹی" ڈاکٹر بلگرامی کا وہی انگریزی مضمون ہے جو سرسید کے بعد "علی گڑھ تحریک" پر ایک اہم اصلاحی مضمون قرار دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے اس کا ترجمہ کر کے سب سے پہلے اپنے رسالہ "افسر" میں شائع کیا تھا۔ اسی ترجمہ کو "ید بیضا" نے کئی برس کے بعد اپنے یہاں نقل کیا ہے۔

معشوق حسین خاں حیدرآبادی (جو بعد میں معشوق یار جنگ کے نام سے مشہور ہوئے) کا مضمون "ایشیا اور یورپ کا مقابلہ" ایک بہت ہی جامع اور عالمانہ مضمون ہے جس سے مقالہ نگار کے گہرے مطالعے اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔

دوسری جلد کا آغاز جنوری ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے۔ اس شمارے میں محمڈن یونیورسٹی، جولیس سیزر اور فرنگ زمانہ تو وہی مسلسل ترجمے ہیں جو پچھلے شماروں میں ناتمام رہ گئے تھے۔ ان کے علاوہ شاہ ایران کی تقریر بھی ایک ترجمہ ہی ہے۔ ان کے علاوہ مولوی ذکاءاللہ خاں دہلوی اور وفا سیتاپوری کے مضامین بھی ایک خاص رنگ کی غمازی کرتے ہیں۔

اس جلد کے دوسرے شمارے (فروری ۱۹۰۶ء) میں ان مسلسل ترجموں کی اقساط کا سلسلہ جاری ہے۔ نثری مضامین میں مولوی ذکاءاللہ خاں کا مضمون "علم" اور عبدالستار خاں کا مضمون "ہندوستان کا افلاس" کافی بیش قیمت مضامین ہیں۔

میرے پاس اس دوسری جلد کے صرف آٹھ شمارے (اگست ۱۹۰۶ء تک) ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا معیار برابر اونچا ہی ہوتا گیا۔ ذیل میں ہم ان قابل ذکر مضامین کی تفصیل پیش کر رہے ہیں جو ان بقیہ پرچوں میں شائع ہوئے ہیں۔

۱۔ عشق میں امتیاز نہیں!	وفا سیتاپوری	مارچ ۱۹۰۶ء
۲۔ تربیت کی اہمیت اور علی گڑھ کالج پر تنقید!	ایڈیٹر	اپریل ۱۹۰۶ء
۳۔ زبان اردو کی خوش نصیبی!	محمود حسن عشقی	״
۴۔ شاہ کابل مرگائے پر دیا اور اس کی جزا!	مولوی ذکاءاللہ خاں	״
۵۔ آزادی کی خواہش اور اس کا استعمال۔	سید محمد حنیف الہ آبادی	مئی ۱۹۰۶ء
۶۔ شاعری جزویست از پیغمبری۔	کارلائل کا ترجمہ	״
۷۔ حضرت برق سکندرآبادی۔	ایڈیٹر	جون ۱۹۰۶ء
۸۔ تربیت کی اہمیت اور علی گڑھ کالج کے متعلق ایک خط	عبدالستار خاں	״
۹۔ رفتار زمانہ	وفا سیتاپوری	جولائی ۱۹۰۶ء
۱۰۔ تنقید (خواب ہستی)	ایڈیٹر	״
۱۱۔ نورجہاں کا مقبرہ اور ایک سیاح۔	وفا سیتاپوری	اگست ۱۹۰۶ء
۱۲۔ مذہب	(کارلائل کا ترجمہ) عبدالغفار اختر الٰہ آبادی	״

"ید بیضا" کا حصۂ نظم زیادہ تر ان مشاعروں کی طرحی غزلوں پر مشتمل ہوتا تھا جو سکندرآباد میں ہوا کرتے تھے۔ چونکہ ان کے

مصرعِ طرح کا اعلان "یدِ بیضا" میں بھی کیا جاتا تھا اور نئے آخری شماروں میں کچھ غیر مقامی شعراء کی غزلوں کا انتخاب بھی شامل ہے جون سنہ ۱۹۰۱ء کے شمارے میں دو دلچسپ نظمیں "معمائے لاینحل اور حل معما" اکبریات کی نظر یاتی کرتی ہیں۔ پہلی نظم "معمائے لاینحل" اکبر الٰہ آبادی کی ایک طویل نظم ہے جو مارچ سنہ ۱۹۰۱ء کے "دکن ریویو" میں شائع ہوئی تھی۔ ۲۴ شعر کی اس نظم میں اکبر نے اپنے روایتی انداز میں سر سید اور علی گڑھ تحریک پر چوٹیں کی ہیں۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے۔

خدا جانے کہا کس نے یہ اک دن سید احمد سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب کے چھٹکارا

اور خاتمہ حافظ شیراز کے اس شعر پر۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کم تر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اس نظم میں کہیں کہیں سر سید کے حوارین پر بھی طنز کیا گیا ہے۔

نہ حالی نے سکت پائی نہ مہدی نے مفر دیکھا
چھٹا ہر دل سے آخر وعظ آزادی کا فوارا
بشیر و حضرت مہدی کو ہے دن رات فکر اسکی
مگر ہیں یہ تو دو سو جیں ادھر غفلت کا ہے دھارا

اسی بحر و ردیف میں عبد الغفار اختر الٰہ آبادی نے "حل معما" کے زیرِ عنوان جوابی نظم لکھی ہے۔ اختر غالباً علی گڑھ کے گریجویٹ تھے چوبیس اشعار کی اس نظم کا خاتمہ بھی حافظ کے اسی شعر پر ہوا جس پر اکبر نے اپنی نظم ختم کی ہے۔ اختر کے آخری چند شعر ہیں۔

مگر اکبر نہ واضح کر سکا مفہوم اصلی کو
فقط بحثوں پہ آمادہ ہوا ہی تھا وہ بیچارا
بڑھا تو تھا وہ آگے کچھ نہ کچھ کہنے کو تھا لیکن
جناب حضرت حافظ نے یوں جنت سے للکارا
حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اپریل سنہ ۱۹۰۲ء کے پرچے میں "محمود حسن عشقی" کے مضمون "زبان اردو کی خوش نصیبی" سے اس دور کی ادبی تاریخ کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے جب ڈاکٹر اقبال بحیثیت غزل گو مقبول ہو چلے تھے۔ ان کی فلسفیانہ نظمیں اور قطعات تو اس سے قبل اپنا ایک مقام پیدا کر چکے تھے لیکن غزل کی دنیا میں وہ جس رنگ سے آ رہے تھے ان کے بعض معاصرین کو پسند نہیں تھا۔ چنانچہ عشقی نے ایک طویل تمہید کے بعد لکھا ہے۔

"اس وقت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء کا "مخزن" ہمارے سامنے ہے اور اس میں حصۂ نظم کے اس موقع کی سیر کر رہے ہیں جہاں ایڈیٹر نے ایک مختصر مگر زوردار تمہید کے ساتھ جناب اقبال کی ایک "غزل" شائع کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ لائق اڈیٹر نے اس غزل کے انتخاب میں ذوقِ تغزل سے ناآشنا ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ "کاش یہ غزل شائع نہ ہوتی" تو حضرت اقبال کی اس خاصی معقول شہرت پر جو انہوں نے بحیثیت ایک نظم نویس کے حاصل کی ہے دھبا نہ آتا۔ یہ غزل صاف بتا رہی ہے کہ جناب اقبال کو تغزل سے کوئی مناسبت نہیں۔ مضمون کا اشہبِ بلیغ دیگر اصنافِ نظم کے میدان میں بھی زبان و محاورات کی غلطی کی ٹھوکر اکثر کھا جاتا ہے تاہم بعض وقت باریک مسائل پر لطیف خیالات اور بلند مضامین اس لطف سے نظم کر جاتے ہیں کہ ان کے عیوب سے چشم پوشی کرنی پڑتی ہے اور طبیعت وجدانی طور پر لطفِ زبان سے متاثر ہو کر زبان کی کمزوری کو بھول جاتی ہے۔ لیکن غزل کے میدان میں تو انہوں نے ناحق ہی قدم رکھا۔ ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ ہم تغزل کو قدیم حسنی میں محدود رکھنا چاہتے ہیں اور حضرت اقبال پر اس لئے اعتراض کر رہے ہیں کہ انہوں نے عاشقانہ انداز سے باہر قدم رکھا ہے۔ ہم تو خود کہتے ہیں کہ اس پٹی لکیر کو چھوڑو لیکن اگر چھوڑو تو اس کا نعم البدل ایسا ہو اگر وہ اسی طرح پُر لطف ہو۔ ورنہ صرف جدت طرازی اصحبِ بیان اور لطف تخیل (اس) کا کافی معاوضہ نہیں ہو سکتی۔"

عشقی کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ مضمون تنقید کے کن اصولوں کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہوگا؟ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال کی پوری غزل پر اسی قسم کے اعتراضات کئے گئے ہیں جو اس دور کا خاصۂ تنقید تھا۔

"یدِ بیضا" کی ضخامت عموماً تین جزو کی ہوا کرتی تھی۔ طباعت اور کتابت اچھی ہے لیکن کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ۔

"میونسپل بورڈ سکندر آباد" کی سرکاری کارروائیاں بطور ضمیمہ شامل کی جاتی تھیں اور نظم کا حصہ بھی صرف دو ہی تین صفحات تک محدود تھا۔

میرے پاس دو جلدوں کے صرف بیس بارہ پرچے موجود ہیں۔ اس کے بعد یہ ماہنامہ کتنے دنوں تک زندہ رہا؟ میری معلومات اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں کرتیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید ایک آدھ سال اور جاری رہا ہوگا کیونکہ سنہ ۱۹۰۲ء یا سنہ ۱۹۰۳ء میں قاضی محمد محسن وفا سیتاپوری کا تبادلہ سکندر آباد سے ہو گیا تھا جو حقیقی معنوں میں اس ماہنامے کے موسس و بانی تھے۔

انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسین، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے "مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ" میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔